# رقعاتِ عبدالحق و دیدہ خوش آب: دو تاریخی دستاویزات

فرزند علی سرور*

عظمت شہزاد**

## Abstract

*Badr Munir is a renowned contemporary researcher, critic and poet. He was born on September 1, 2014 in the village of Khor in Wadi e Soan Skaisar, Khushab District. When it comes to serious and humorous poetry, Badar's name is quite popular in the literary circles. Khushab district is famous for its scholarly and literary personalities. The personalities like Ahmad Nadeem Qasmi, Johar Nizami and Dr. Najiba Arif have rendered unforgettable services in the field of literature. Badar Munir's 'Deed a Khush Aab' covers the literary history of District Khushaab as a whole. Meanwhile, Badr Munir has done commendable literary work by compiling Maulvi Abdul Haq's unpublished letters in the form of "Ruqaat-e-Abdul Haq" according to the principle of research. Maulvi Abdul Haq is a pioneer of Urdu literature. The Urdu language is incomplete without him. Maulvi Abdul Haq's historic letters are literary documents of his era, and while going through it the readers goes back in time, and experiences the same atmosphere and breathe in his era. Maulvi Abdul Haq's correspondence with eminent scholars and literary personalities of his time are of immense importance. In these letters, there is a detailed mention of literary associations and libraries of*

---

* سکالر، اردو ادب، قائداعظم یونی ورسٹی، اسلام آباد

** لیکچرار، شعبہ اردو، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج، چکوال

*this era. On various topics, literary debate between Maulvi Abdul Haq and eminent researchers of this era is also found. Raqaat-e-Abdul Haq is an invaluable treasure of knowledge and literature, the compilation of which is undoubtedly significant in the field of research. In the present article, an intellectual and critical review of both the books of Badr Munir has been presented in detail. A brief sketch of thoughts and art of the poets included in 'Deeda e Khosh Aab' has also been presented. For this, the author's style of writing has also been brought under discussion.*

## تلخیص

بدر منیر عہدِ حاضر کے نامور محقق، نقاد اور شاعر ہیں۔ وہ یکم ستمبر ۱۹۶۴ء کو وادیٔ سون سکیسر، ضلع خوشاب کے گاؤں کھوڑ میں پیدا ہوئے۔ سنجیدہ وظریفانہ شاعری کے میدان میں طبع آزمائی کی اور قلیل عرصے میں مقبول ہو گئے۔ ضلع خوشاب علمی و ادبی شخصیات کے حوالے سے خاصی شہرت کا حامل ہے۔ احمد ندیم قاسمی، جوہر نظامی اور ڈاکٹر نجیبہ عارف جیسی شخصیات نے ادب کے میدان میں ناقابلِ فراموش خدمات سرانجام دی ہیں۔ بدر منیر نے دیدہ خوش آب میں ضلع خوشاب کی عظیم شخصیات کے احوال و آثار کو جانفشانی سے مرتب کیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے اس خطے کی ادبی تاریخ کا کلی طور پر احاطہ ممکن ہے۔ علاوہ ازیں بدر منیر نے ''رقعاتِ عبدالحق'' کی صورت میں مولوی عبدالحق کے غیر مطبوعہ مکاتیب کو اصولِ تحقیق کے مطابق مدوّن کر کے ادبی کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ مولوی عبدالحق اردو ادب کے سرخیل ہیں۔ زبانِ اردو کا تذکرہ ان کے بغیر نامکمل ہے۔ مولوی عبدالحق کے خطوط ان کے عہد کی ادبی دستاویز ہیں جن کو پڑھ کر قاری ان کے عہد میں سانس لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مولوی عبدالحق کی خط و کتابت اپنے عہد کے نامور محققین اور ادبی شخصیات کے ساتھ رہی۔ ان خطوط میں اس عہد کی ادبی انجمنوں اور کتب خانوں کا تفصیلی تذکرہ ملتا ہے۔ مختلف موضوعات پر مولوی عبدالحق اور اس عہد کے نامور محققین کے مابین علمی و ادبی بحث بھی ملتی ہے۔ رقعاتِ عبدالحق، علم و ادب کا بیش بہا خزینہ ہے جس کی تدوین بلاشبہ تحقیق کے میدان میں کارہائے نمایاں ہے۔ زیرِ نظر مقالے میں بدر منیر کی دونوں کتب کا فکری و فنی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ دیدہ خوش آب میں شامل شعراء کے فکر و فن پر اجمالی نگاہ دوڑائی گئی ہے۔ اس کے لیے مؤلف کے اسلوب نگارش کو بھی زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ ''رقعاتِ عبدالحق'' میں محقق کے

اسلوب اور مدون خطوط کا فنی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ یہاں، دیدہ خوش آب اور رقعات عبدالحق کا موضوعاتی اور تکنیکی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

## (الف) دیدہ خوش آب (موضوعاتی و تکنیکی مطالعہ)

بدر منیر نے شعر و نثر تحقیق و تنقید کے میدان گرانمایہ خدمات سرانجام دی ہیں۔ دیدہ خوش آب ان کی تحقیقی کاوش ہے جس میں انہوں نے مختلف شعراء کے کلام کو نہ صرف یکجا کیا ہے بلکہ ان کے احوال اور شاعری کا تجزیہ بھی پیش کیا ہے۔ احوال و آثار کے ضمن میں لکھی گئی بہت سی کتب محض اس لئے مرتب کی گئی ہیں کہ اس سے چند شعراء کا تذکرہ مل جاتا ہے اور بیشتر مرتبین اس بات کا خیال نہیں رکھتے کہ کتاب میں شامل کئے گئے شعراء کا ادبی مقام کیا ہے۔ تاہم دیدہ خوش آب میں شامل شعراء اپنی مثال آپ ہیں۔ فکر و فن کی بلندیوں کو چھونے والے شعراء سے لے کر ان تمام شعراء کا بھی ذکر اس کتاب میں ملتا ہے جنہیں گزدِ زمانہ نے پنپنے نہ دیا لیکن ان کا فکر و فن کسی بھی طور عہد حاضر کے شعری تقاضوں سے کم نہیں۔ ان شعراء کی قادرالکلامی ان کی فکری و فنی محاسن کے مطالعہ سے پوری طرح واضح ہے۔ یہ اس بات کا بھی بین ثبوت ہے کہ محقق نے عرق ریزی کے بعد اہم شعراء کا نہ صرف کلام یکجا کیا ہے بلکہ انتخاب کے ضمن میں بھی پوری دلجمعی کے ساتھ ورق گردانی کرتے ہوئے عمدہ ترین اشعار قارئین کی نظر کئے ہیں۔ ان شعراء کی فکری و فنی جہتوں کا مطالعہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

### صنعت تکرار / تکرارالفاظ:

ڈاکٹر یوسف حسین خان یوں رقمطراز ہیں:

> ”لفظوں کی تکرار بالعموم نثر اور شعر دونوں میں معیوب سمجھی جاتی ہے لیکن اگر لفظوں کی تکرار اور الٹ پھیر ایک خاص سلیقے سے کی جائے اور وہ رمزی اور ایمائی اثر بڑھانے میں مدد دے تو کلام کی بلاغت اور حسن میں اضافہ ہوگا۔ غزل میں وزن اور بحر اور ردیف قافیے یک تکرار بھی اسی مقصد کے لئے ہوتی ہے۔ بعض وقت لفظوں کی تکرار اس واسطے پسند ہوتی ہے کہ دل جس چیز کو چاہتا ہے اور پہچانتا ہے وہ بار بار سامنے آتی رہے۔ لفظوں کے خیالی پیکروں سے جذبہ اپنے آپ کو وابستہ کر لیتا ہے تو یہ صورت پیدا ہوتی ہے۔ تکرار سے ان خیالی پیکروں کے نقوش میں گہرائی پیدا ہو جاتی ہے (۲)

### واصف علی واصف

واصف علی واصف اپنے عہد کے بہت بڑے صوفی اور رہبر کامل تھے جنہوں نے اپنے ملفوظات اور

شاعری کے ذریعے لوگوں کی باطنی اصلاح کا عظیم کام سرانجام دیا۔ان کا ذکر جامع تعارف کے ساتھ دیدہ خوش آب میں ملتا ہے۔

صنعت تکرار لفظی کا خوبصورت استعمال واصف کے شعروں کا خاصا ہے۔نمونے کے اشعار ملاحظہ کیجئے:

اک آسمان مری گود میں تھا ہجر کی شب
قدم قدم پہ درخشاں شہاب تھے کتنے (۳)

واصف علی واصفؔ کے ہاں فکر بھی حقیقت کی عکاس ہے، مثال کے طور پر زندگی سے متعلق ان کا یہ شعر دیکھئے:

کھلی جو آنکھ پسِ مرگ تو یہ راز کھلا
کہ ایک خواب کے عالم میں خواب تھے کتنے (۴)

## احمد ندیم قاسمی:

احمد ندیم قاسمی نے ۱۹۳۵ء میں پنجاب یونیورسٹی سے گریجویشن کی۔ اس کے بعد افسانہ نگاری اور شاعری کے آغاز کے ساتھ ساتھ ملازمتوں کا سلسلہ شروع کیا۔ دارالاشاعت پنجاب لاہور میں مترجم کی حیثیت سے کام کیا، پھر سب انسپکٹر ملتان مقرر ہوئے۔ موقر اور مقبول جرائد پھول، تہذیب نسواں، ادب لطیف، سویرا، نقوش، صحیفہ اور امروز کے مدیر رہے (۵)

ان کی شاعری آفاقی خصوصیات کی حامل ہے۔ان کے فکروفن نے عہد حاضر کو متاثر کیا۔ دومعنویت ان کے کلام کا خاصا ہے اگر وہ ترقی پسند تھے تاہم ان کے ہاں رومانویت اور غم بھی موجود ہے جو اپنے عہد کا عکاس ہے۔

## دومعنویت:

احمد ندیم قاسمی کے اشعار میں دومعنویت موجود ہے، مثال کے طور پر:

تجھ کو کھو کر بھی تجھے پاؤں جہاں تک دیکھوں
حسن یزداں سے تجھے حسنِ بتاں تک دیکھوں (۶)

**رومانویت:**

ذہنی تلاطم کے دور میں جو تحریک وجود میں آتی ہے اس میں حرکت اور عمل کا تناسب زیادہ ہوتا ہے۔ یہ انسانی بپھرے ہوئے جذبات کو قابو کرنے کی کوشش کرتی ہے اور آگے بڑھنے کا وجود رکھتی ہے، تنوع، حرکت اور خواب ناک صورت حال کے اس زاویے سے تحریک کے پیش نظر مستقبل زیادہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ ایسی صورت حال کو رومانی تحریک کا عنوان دیا جاتا ہے(۷)

رومانویت کا تعلق چوں کہ شعور کے بجائے لاشعور سے ہے اس لئے یہ ایک انتہائی پیچیدہ نفسیاتی کیفیت ہے اب تک اس کے کئی زاویے نظر سے گزر چکے ہیں لیکن کوئی بھی جامع تعریف مرتب نہیں ہوسکی (۸)

رومانی تحریک اس فوج کی طرح ہے جو کسی تیز جذباتی کیفیت میں دشمن کے ملک کو نیست و نابود کر کے گزر جاتی ہے اور پھر اس ملک پر قبضہ کر کے مطمئن ہو جاتی ہے(۹)

احمد ندیم قاسمی کے ہاں محبوب کا حسن اس کے ظاہر و باطن کی کہانی ہے، وہ اپنے محبوب کو سننا چاہتے ہیں، مثال کے طور پر:

صرف اس شوق میں پوچھی ہیں ہزاروں باتیں
میں ترا حسن، ترے حسن بیاں تک دیکھوں (۱۰)

**بے بسی:**

احمد ندیم قاسمی کے ہاں غم واندوہ بے بسی اس معاشرے کی کہانی ہے جہاں ہر ایک شخص بے بس ہے۔ یہ منظر اہل دل کے لئے کسی قیامت سے کم نہیں کہ ہر شخص یہاں ظلم و ستم اور بربریت کا شکار ہے۔ اس منظر نامے کی عکاسی احمد ندیم قاسمی نے کچھ اس انداز میں کی ہے:

دل گیا تھا تو یہ آنکھیں بھی کوئی لے جاتا
میں فقط ایک تصویر کہاں تک دیکھوں (۱۱)

**جوہر نظامی:**

بدر منیر نے جوہر نظامی جیسے خوبصورت شاعر کے احوال کو شامل تحقیق کر کے ادبی منظر نامے میں ایک اہم کام سرانجام دیا ہے۔ جوہر نظامی کا اصل نام راجہ عبدالغفور ہے جو کہ ۱۹۰۹ء میں سرگودھا میں پیدا ہوئے

اور ۱۹۹۶ء میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے، بدر منیر ان کے بارے میں رقمطراز ہیں:

''جوہر نظامی سادہ، شستہ، پُرخلوص اور غم کوش شخصیت کے مالک تھے۔ آزادی سے قبل سرگودھا میں ان کی کوششوں سے مشاعروں کی روایت کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ اسی لئے ڈاکٹر انور سدید نے سخنواران سرگودھا میں، سرگودھا کی ادبی تاریخ کے پہلے دور کو جوہر نظامی کے نام سے موسوم کیا اور اہل سرگودھا نے انہیں ممتاز الشعراء کا خطاب دیا۔ ۱۹۵۲ء میں جوہر آباد منتقل ہوئے تو یہاں بھی شعر و سخن کی محفلوں کی جان بن گئے غزلیات کے دو مجموعے لوحِ محفوظ (۱۹۷۸ء) اور وہم رسا (۱۹۸۸ء) شائع ہو چکے ہیں۔ نعت، منقبت، سلام اور مرائی کا مجموعہ برج نور ۲۰۰۰ء میں طبع ہو چکا ہے'' (۱۲)

جوہر نظامی کی شاعری فکر و فن کی بلندیوں پر ہے۔ ان کے وہاں تتبر استعارہ اور تلمیحات میں انوکھا استعمال ملتا ہے۔

## استعارہ:

استعارہ کے لغوی معنی ''ادھار لینا'' کے ہیں۔ اصلاح میں استعارہ سے مراد یہ ہے کہ کسی چیز کے لوازمات کو کسی اور چیز سے منسوب کر دینا یا یوں کہیں کہ جو لفظ اپنے مجازی وغیرہ وضعی معنوں میں استعمال ہو اور حقیقی و مجازی مفہوم میں تشبیہ کا تعلق پایا جائے، استعارہ کہلائے گا۔

پروفیسر حمید اللہ شاہ ہاشمی استعمارہ کی تعریف کچھ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''استعارہ کے لغوی معنی مانگنا، مستعار لینا، ادھار لینا ہیں۔ اصطلاح میں استعارہ سے مراد یہ ہے کہ حقیقی اور مجازی معنی کا لباس عاریتاً مانگ کر مجازی معنی کو پہنانا استعارہ کہلاتا ہے۔ اس لفظ میں اپنے لغوی معنی ترک کر کے لسانی سیاق وسباق کے اعتبار سے نئے معنی اختیار کرتا ہے'' (۱۳)

بدر منیر کا استعاراتی انداز ملاحظہ کیجئے:

احساس کی دنیا میں اجالا نہیں تم ہو
ہر سمت پہ اک نور کا ہالا نہیں تم ہو
لب پہ جو تھرکتی ہے وہ میری نہیں آواز
دل سے جو نکلتا ہے وہ نالا نہیں، تم ہو
صحرا میں بگولوں کا یہ چکر نہیں میں ہوں
یہ باغ میں رقصِ گل لالہ نہیں تم ہو

وجدان کی دنیا میں در آئے ہو تم ایسے
گردن میں فقیروں کے یہ مالا نہیں تم ہو
ہر شعر مرا جوہرِ عرفانِ غزل ہے
یہ روشنی، عالمِ بالا نہیں تم ہو (۱۴)

## تراکیب کا استعمال:

جوہر نظامی نے تراکیب کا بھی بڑا خوبصورت استعمال کیا ہے۔ مثال کے طور پر:

پرواز کا شعور تو مرغِ چمن کو ہے
آزادی شعور مگر زیرِ دام ہے
انسانیت ہے دائرہ نظم و ضبط میں
آزاد کب ہے فطرتِ انساں غلام ہے
ہو کیوں نہ مجھ کو بے خودی جاوداں نصیب
حاصل مرے جنوں کو بقائے دوام ہے
منزل سے دور وادی گمنام میں کہیں
شاید قیام جوہرِ بے ننگ و نام ہے (۱۵)

## تکرار:

تکرار لفظی کا نہایت خوبصورت استعمال جوہر نظامی کی شاعری میں ملتا ہے۔ نمونے کے اشعار دیکھئے:

کوئی غم غم نہیں جب تو ہے موجود
کوئی غم غم نہیں ہے تیرے ہوتے
بفیض طالع بیدار جوہر
گزاری ہم نے اب تک سوتے سوتے (۱۶)

## چھوٹی بحر کا استعمال:

جوہر نظامی نے چھوٹی بحر کا استعمال نہایت عمدہ طریقے سے کیا ہے۔ کم الفاظ میں مدعا بیان کرنا جوہر

نظامی کی شاعرانہ استعداد کا ثبوت ہے۔مثال کے طور پر:

کٹی ہے عمر اکثر خون روتے
لہو سے آستینوں کو بھگوتے (۱۷)

## قاضی خضر جمال:

قاضی خضر جمال کا شمار خوشاب کے سینئر ترین شعراء میں ہوتا ہے۔ان کے چاہنے والے ملک کے ہر گوشے میں موجود ہیں۔نو جوان شعراء پر ان کی خصوصی توجہ ہے۔ان سے متعلق بدر منیر رقم طراز ہیں:

''قاضی خضر جمال کو زندگی کے لف و دق صحرا سے اور سرابوں سے گزرنا پڑا مگر ہر بار انہوں نے حیات آفریں تبسم کے ساتھ اپنے فنی سفر کو جاری رکھا۔غم جاناں اور غم دوراں کے سخت مقامات سے وہ بڑی خوش دلی اور خوش اسلوبی سے عہدہ برآہ ہوئے۔وہ دل وجگر پر لگنے والے زخموں کو چراغوں سے تعبیر کرتے ہیں۔جن کی روشنی سے ان کا پورا وجود بقعہ نور بن جاتا ہے۔وہ زمانے کے دیے ہوئے دکھوں اور غموں پر دلبرداشت ہونے کے بجائے انہیں اعزاز سمجھ کر اپنے سینے پر سجا لیتے ہیں۔شعور کی صلیب کو بوجھ تصور نہیں کرتے اور نہ ہی اس بوجھ تلے دب کر آہ و بکا کرتے ہیں۔ان کے اسقاد سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ فنکار کے وجود کو ختم کیا جا سکتا ہے لیکن اس کے جذبوں اور آدرشوں کو نہیں دبایا جا سکتا''(۱۸)

قاضی خضر جمال کی شاعری کا فکری وفنی مطالعہ بدر منیر نے بہ طریق و حسن کیا ہے۔ان کے کلام میں موجود فکر وفن کے روشن پہلوؤں کا احاطہ بڑی چابک دستی سے کیا گیا ہے۔ذیل میں ہم بدر منیر کے تنقیدی رویے کا جائزہ لیں گے:

## ترکیب:

قاضی خضر جمال نے تراکیب کا خوبصورت استعمال کیا ہے جیسا کہ:

تری نگہِ کرم جس پر ہو، اس شاخِ تمنا تک
خزاؤں میں بہارِ شادمانی جا پہنچتی ہے (۱۹)

علم بدیع کی رو سے تلمیح سے مراد یہ ہے کہ کلام میں کسی مشہور قصہ، واقعہ، کہانی، قرآنی آیت یا کسی فنی اصطلاح کی طرف اشارہ کرنا۔

سید عابد علی عابد تلمیح کے حوالے سے یوں رقم طراز ہیں:

''اس کی صورت یہ ہے کہ شاعر اپنے کلام میں کسی مشہور مسئلے یا قصے یا اصطلاح وغیرہ کی طرف اشارہ کرے اور

جب تک یہ اشارہ توضیح کا رنگ اختیار نہ کرے، شعر کا صحیح مفہوم متعین نہ ہو‘‘ (۲۰)

## تلمیح:

قاضی خضر جمال کے ہاں خوبصورت تلمیحات کا استعمال ملتا ہے:

پا ہی لوں گا ایک دن لیلائے منزل دیکھنا
رہنما ہیں قیس کے نقشِ قدم میرے لئے (۲۱)

## شفیع ضامن:

شفیع ضامن کی تخلیقی انفرادیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے فنون میں اپنی چند غزلوں کی اشاعت سے ہی جدید غزل گو شعراء میں اہم مقام حاصل کر لیا۔ شفیع ضامن کی ابتدائی تعلیم نوشہرہ میں مکمل ہوئی۔ بعد ازاں فوج میں بھرتی ہو کر ۲۸ سال سگنلز آرمی ایجوکیشن کور میں خدمات سرانجام دیں۔ دوران ملازمت بی۔اے کر کے جونیئر کمیشنڈ آفیسر ہو گئے۔ آرمی سے ریٹائرمنٹ کے بعد اسلام آباد کالج برائے طلباء میں ۱۶ سال تک ۱۹۸۲ تا ۱۹۹۸ء درس و تدریس کے کام میں منہمک رہے۔ انہوں نے شاعری کے ساتھ ساتھ معاصر تخلیق کاروں کے بہت خوبصورت اور عمدہ خاکے بھی لکھے ہیں (۲۲)

ان کی شاعری کے فکری و فنی محاسن کا احاطہ پیش ہے:

### التجائیہ انداز:

اسے پامال تو اس کو پسر انداز کرنا
ہمیں آیا نہ اب تک خود کو سرافراز کرنا
رہائی پا کے بھی اڑنے سے یوں معذور ہیں ہم
کہ جیسے ہم نے سیکھا ہی نہ تھا پرواز کرنا
وہ جس سے آئینہ ہو جائیں سب اسرار دل کے
خدایا! مجھ پہ بھی وہ ساتواں درباز کرنا
ہے اس کو کاروبار عشق سے پرہیز لازم
نہ آتا ہو جسے تہمت کو بھی اعزاز کرنا (۲۳)

**استفہامیہ انداز:**

انہوں نے استفہامیہ انداز میں بھی شاعری کی ہے۔جس کی مثال ہمیں غالب اور میر کے ہاں بدرجہ اتم ملتی ہے۔ مذکورہ اساتذہ کے علاوہ دبستان دہلی اور لکھنو کے بے شمار اساتذہ نے استفہامیہ لہجے میں غزل کو برتا ہے۔جس کی بدولت ان کی شاعری میں ایک مترنم کیفیت نے جنم لیا ہے۔ شفیع ضامن کے ہاں بھی اسے مضامین بکثرت ملتے ہیں:

خود اپنی آنچ سے اک شخص جل گیا مجھ میں
یہ میں نہیں ہوں تو پھر کون ڈھل گیا مجھ میں
یہ کون ہے جو اچانک دہل گیا مجھ میں
یہ آئینے میں مرے عکس کے سوا کیا تھا
دھنک کے رنگ بھلا کون چھو سکا ضامن
یہ آج کیوں میرا بچپن مچل گیا مجھ میں (۲۴)

**تکرار لفظی:**

تکرار لفظی بھی ایک حسن صفت ہے اگر چہ تکرار سے شعر کا لطف جاتا رہتا ہے تاہم کئی با کمال شعراء اس صنعت سے شعر میں صفت پیدا کر لیتے ہیں۔ شفیع ضامن کی شاعری میں تکرار کا بارہا استعمال ملتا ہے تاہم یہ تکرار شعر کر بدمزہ نہیں کرتی بلکہ شعر کا لطف دوبالا کر دیتی ہے۔صنعت تکرار کے استعمال سے شفیع ضامن نے جدید شاعری میں قدیم کے امتزاج کو بخوبی برتا ہے:

یہ کس نے میرا بھرم چھید چھید کر ڈالا
یہ کون تیر کی مانند چل گیا مجھ میں (۲۵)

آپ چاہیں تو اسے رونق ہستی کہہ لیں
ایک محشر سا بپا میں نے تو گھر گھر دیکھا (۲۶)

**منظر نگاری:**

شفیع ضامن قادرالکلام شاعر تھے۔ انہوں نے اپنی شاعری سے مصوری کا جادو بھی جگایا ہے۔ ان کے اکثر اشعار پڑھنے سننے والے پر تو رقت طاری کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ آنکھوں کے سامنے جیتا جاگتا منظر بھی آ جاتا ہے، مثال کے طور پر:

اپنے اندر جو کبھی ہم نے اتر کر دیکھا
دل میں اترا ہوا خود اپنا ہی خنجر دیکھا (۲۷)

## نجیبہ عارف:

نجیبہ عارف (۲۸) عہد حاضر کی محقق، نقاد اور دانشور ہیں۔ شاعری میں بھی وہ منفرد مقام رکھتی ہیں۔ ان کے کلام کے فنی محاسن ملاحظہ کیجئے:

### تشنگی:

انسان کی حسرتیں اور آرزوئیں ہمیشہ ناتمام رہتی ہیں۔ بقول شاعر:

تمنا وہ تمنا ہے جو مرکر بھی پوری نہ ہو
جو دل ہی دل میں رہ جائے اسے ارمان کہتے ہیں (۲۹)

جو دل ہی دل میں رہ جائے اسے ارمان کہتے ہیں، نجیبہ عارف کے ہاں بھی دیگر شعراء کی طرح خواہش، آرزو اور تمنا انسانی جذبات کا روپ دھارے پورے آب و تاب کے ساتھ جلوہ نما ہے:

رہی آرزو ترے حسن کو یوں نگاہ و دل میں سنبھالتے
کہ جو ماورائے خیال ہے اسے لفظ میں کبھی ڈھالتے !
تری راہ میں جو بچھا دیئے وہی خواب میری پناہ تھے
انہیں روندتے یا سمیٹتے یا کچھ اور ان کو نکھارتے (۲۹)

## ڈاکٹر ناہید قاسمی:

گزشتہ تین دہائیوں میں نئی نظم کے حوالے سے جن شعراء نے اہل ذوق کی توجہ حاصل کی ہے۔ ان میں ناہید قاسمی کی آواز یکسر مختلف ہے۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی کے بارے میں بدر منیر رقمطراز ہیں:

''اس کی آواز کی انفرادیت نسوانی جذبات کی مرہون منت نہیں بلکہ فکر و احساس کی تہذیب اور اظہار و ابلاغ

کی شائستگی سے عبارت ہے۔ ناہید قاسمی عصر حاضر کی عظیم ادبی شخصیت احمد ندیم قاسمی کی دختر نیک اختر ہیں'' (۳۰)

پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اردو کرنے کے بعد تدریس کے شعبہ سے منسلک ہوئیں۔ان کی نظمیں تواتر سے فنون میں چھپتی ہیں۔دو کتب ناصر کاظمی فکروفن (تنقید) اور بنجر دل سیراب کرو (نظمیں) شائع ہو چکی ہیں۔پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ ''جدید اردو شاعری میں فطرت نگاری کا جائزہ'' کے عنوان سے زیر طبع ہے۔ناہید قاسمی کی شاعری حسن وخیر اور حق وصداقت کی ابدی اقدار سے اٹوٹ وابستگی کا مظہر ہے۔مگر اظہار میں ترقی پسند شاعری کے بلند آہنگ کے برعکس سادگی معصومیت اور بے ساختگی قابل تحسین ہے۔ان کے ہاں زندگی کے مہکتے، میٹھے، متحرک اور گریز پا حسن کی جلوہ گری کے ساتھ ساتھ سفاک اور ستمگار چلن کی حقیقت پسندانہ جھلک موجود ہے۔وہ زندگی اور انسان سے مایوس نہیں ہوتیں، صرف اداس ہو جاتی ہیں۔ان کی شاعری مجموعی طور پر تنقید حیات نہیں بلکہ تحسین حیات ہے۔ان کی نظمیں اپنے حسن کے ساتھ ساتھ کم بیانی اور کفایت لفظی میں اپنی مثال آپ ہیں۔ان کی ذاتی اور شعری کائنات پر محبت کے جذبات کی حکمرانی ہے۔وہ زندگی کے کرم اور ستم ہر دو کا خیر مقدم، فیاض اور عمیق جذبے کے ساتھ کرتی ہے (۳۱)

جدید اردو نظم بارے بلراج کومل کی رائے ملاحظہ کیجئے:

''جدید اردو نظم بھی میرے نزدیک مختلف انسانی جزیروں میں سے ایک سرسبز جزیرہ ہے''۔(۳۲)

اصل میں قدیم شعراء اور نقادوں کے ہاں نظم کا کوئی تصور نہ تھا۔انہوں نے شعری سرمائے کو مکمل طور پر ہیئت کے لحاظ سے غزل، قصیدہ، مثنوی، قطعہ اور رباعی وغیرہ کے نام سے تقسیم کر رکھا تھا۔نظم کا تصور سب سے پہلے حالی کے ہاں ملتا ہے۔انہوں نے غزل کے روایتی موضوعات سے ہٹ کر نیچرل نظموں پر زور دیا (۳۳)

گوپی چند نارنگ نظم بارے لکھتے ہیں:

''نظم جتنی زیادہ استعاراتی یا علامتی ہوگی، تہ نشیں بیانہ میں خاموشیاں اتنی زیادہ ہوں گی یا خالی جگہیں ہوں گی یا کچھ کڑیاں حذف ہوں گی اور نظم میں معنی چوں کہ کئی سطحوں پر کارگر ہوتا ہے یا طرفیں رکھتا ہے، ان سب کو کھولنا قرأت کے تفاعل یا جمالیاتی لطف اندوزی کا حصہ ہے'' (۳۴)

''نظم جدید'' تمام قدیم اصناف سخن سے بالکل مختلف چیز ہے۔اس لئے یہ ایک الگ اور جدید صنف شعر ہے۔

'''' نظم جدید'' میں موضوعات یا ہیئت کی کوئی قید نہیں البتہ زبان، طرز بیان اور اپنے علامتی انداز کے سبب یہ دیگر اصناف سے ممیّز کی جا سکتی ہے (۳۵)

جدید نظم کے بارے میں ریاض احمد فرماتے ہیں:

''جدید نظم کی امتیازی خصوصیت اس کا تمثیلی انداز ہے''(۳۶)

کہا جا سکتا ہے کہ نظم جدید کا موضوع انتہائی وسعت رکھتا ہے کیونکہ جدید دور میں فرد کی سوچ اور اس کی ذات پر اثرات کا دائرہ بے حد وسیع ہو چکا ہے۔ با اعتبار ہیئت نظم جدید کی متعدد شکلیں ہیں مثلاً پابند نظم، معرّیٰ نظم، آزاد نظم اور سانٹ(۳۷)

ڈاکٹر ضیاء الحسن جدید نظم کے بارے میں یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

''آزاد نظم کے بعد جدید اردو نظم میں سب سے بڑا ہیئتی تجربہ نثری نظم کی صورت میں ہوا اسے آسانی سے نظم کی ارتقائی کڑی قرار دیا جا سکتا ہے۔ نظم معرّیٰ سے قبل قافیے کے بغیر نظم کہنے کا تصور نہیں تھا۔ آزاد نظم سے قبل عروض آہنگ کو منقسم کرنے کا تصور نہیں تھا۔ نظم نے پہلے قافیہ سے آزادی حاصل کی، پھر متعین عروضی پیٹرن سے آزادی حاصل کی اور پھر عروضی آہنگ سے آزاد ہوئی''(۳۸)

جدید نظم کے تناظر میں ناہید قاسمی کی نظموں کا فکری و فنی جائزہ پیش خدمت ہے۔

ڈاکٹر ناہید قاسمی نے نظم میں نہ صرف پنجابی الفاظ کو خوش اسلوبی کے ساتھ برتا ہے بلکہ استعاراتی زبان کو استعمال کرتے ہوئے داخلی کرب کا اظہار کیا ہے۔ ان کے تکرار لفظی کی صنعت کا استعمال بھی نظر آتا ہے۔ کہیں کہیں استفہامیہ لہجہ انہیں آج کے نظم گو شعراء سے ممتاز کرتا ہے۔

ان کی نظم ''مراجعت'' کو ملاحظہ کیجئے:

## مراجعت:

بھودے پہاڑوں
نیلے چشموں
چٹے رتے کنکروں
اور پھر ساوی ساوی جھاڑیوں سے
ہم ہاتھ چھڑاتے اور دامن جھٹکاتے
کیسی کیسی امیدوں کی گٹھڑی باندھے
شہر میں آ پہنچے تھے
لیکن شہر تو جیسے لُٹ سے گئے تھے

سُکھ غائب تھے، دُکھ موجود تھے
دُکھ سڑکوں پر کانٹے بن کر بکھرے تھے
اور سکھ دو چار گھروں کی ''سیفوں'' میں مدفون پڑے تھے
اب کہ شاید اپنے گاؤں پلٹنا ہوگا
اے میرے گاؤں! کیا تم ہم مفروروں کو؟
اپنی ہری بھری اور سوندھی گود میں واپس لے سکتے ہو؟ (۳۹)

## ولایت احمد فاروقی:

بدر منیر ولایت احمد فاروقی کے بارے میں رقمطراز ہیں:

''ولایت احمد فاروقی، ادبی صحافتی اور ثقافتی سرگرمیوں میں منہمک رہنے والی متحرک شخصیت کے مالک ہیں۔ محدود مواقع اور ناکافی وسائل کے باوجود ان کی کامیابیاں اور کارگزاریاں قابل تعریف ہیں۔ میٹرک کا امتحان ۱۹۸۶ء میں گورنمنٹ ہائی سکول خوشاب سے ہائی فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ جامعہ پنجاب سے بی اے اور ایم اے اردو کی اسناد حاصل کیں۔ محکمہ تعلیم میں بطور استاد فرائض انجام دینے کے ساتھ ساتھ جامعہ پنجاب ہی سے بی ایڈ بھی کرلیا پنجابی اور سرائیکی میں پہچان بنانے کے بعد اردو شاعری کی طرف راغب ہوئے۔ مزید آگے بڑھنے کی دھن اور لگن میں کچھ اور چاہیے وسعت میرے بیان کے لئے مصداق اپنے گاؤں کریالکہ سے تبادلہ کروا کے لاہور منتقل ہوگئے۔ جہاں مختلف ادبی، ثقافتی کے ممبر اور عہدیدار بن گئے''(۴۰)

ان کے فکر وفن کا جائزہ پیش خدمت ہے۔

## بے چارگی:

ولایت احمد فاروقی کے ہاں بے چارگی و بے بسی بدرجہ اتم موجود ہے، وہ تمنا کے کھو جانے کو اپنے حوصلوں کی شکست مانتے ہیں:

جب سے اکلوتی تمنا قتل کر ڈالی گئی
سانس ہیں اکھڑے ہوئے تو حوصلے ٹوٹے ہوئے (۴۱)

## کرب:

شاعر ایک حساس انسان ہوتا ہے جو اپنے گردوپیش سے متاثر ہوتا ہے اور معاشرے کے کرب کو اپنے لفظوں میں سمو لیتا ہے۔ ولایت احمد فاروقی کے ہاں بھی اجتماعی ایسے ملتے ہیں جو اس معاشرے کے کرب کو ظاہر کرتے ہیں:

ہائے کیا ٹوٹی قیامت گلستاں پر دوستو
سربریدہ پیڑ پر ہیں گھونسلے ٹوٹے ہوئے (۴۲)

## تضاد:

ولایت احمد فاروقی نے صنعت تضاد کا خوبصورت اور برمحل استعمال اشعار میں کیا ہے:

دوستی کا حق ادا ہونے لگا
جسم سے سایہ جدا ہونے لگا (۴۳)

## ب) رقعات عبدالحق (موضوعاتی و تکنیکی مطالعہ)

ڈاکٹر بدر منیر کی نثری خدمات کے حوالے سے ''رقعات عبدالحق'' بھی نہایت اہمیت کے حامل ہے جس میں انہوں نے مولوی عبدالحق کے غیر مدون خطوط کی تدوین کا اہم کام سرانجام دیا ہے جو کہ بلاشبہ قابل تحسین فعل ہے۔ ان کے اس تحقیقی کام کو ادبی حوالے سے بھی سراہا گیا ہے۔ مولوی عبدالحق کے ان نادر خطوط کا منصۂ شہود پر آنا تحقیقی دنیا میں واقعتاً ایک ادبی و تحقیقی کارنامہ ہے۔ ''رقعات عبدالحق'' ۴۲۳ خطوط پر مشتمل ہے۔ یہ مجموعہ دیگر مطبوعہ مجموعوں پر سبقت اس لئے بھی رکھتا ہے کہ اس میں زیادہ تعداد میں نئے خط شامل کئے گئے۔ تدوین شدہ خطوط ادبی حوالے سے اس لئے بھی اہمیت کے حامل ہیں کہ اس سے ایک ادبی تاریخ پڑھنے کو ملتی ہے اور بطور خاص مولوی عبدالحق کی علمی و ادبی سرگرمیوں سے بھی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ ڈاکٹر بدر منیر کی نثری خدمات کے حوالے سے ذیل میں ''رقعات عبدالحق'' کا فکری وفنی اور تحقیقی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ نیز مولوی عبدالحق کی معاصر تاریخ، ان کے افکار و نظریات، جذبات اور میلانات و رجحانات کا تذکرہ بھی کیا جائے گا۔

متذکرہ خطوط سے مولوی عبدالحق کا اردو سے لگاؤ اور ادبی خدمات ظاہر ہوتی ہیں۔ اردو سے متعلق سیر حاصل مباحث، تحقیق اور جستجو قاری میں لکھنے پڑھنے اور تحقیق کی خو پیدا کرتی ہے۔ ان مباحث میں کہیں وہ علمی وادبی تجاویز بھی دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے باوصف خطوط میں مختلف ادبی انجمنوں اور کتب خانوں کا ذکر ہے جو قاری کو اپنی طرف راغب کرتے ہیں۔ اردو سے لگاؤ کی اہمیت اپنی جگہ مقدم ہے مگر ان خطوط میں خالصتاً ادبی لہجہ قاری کو ورطہ حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ بدر منیر کی اس ادبی خدمت سے مولوی عبدالحق کے بیشتر اوصاف بھی کھل کر سامنے آئے ہیں جن میں بطور خاص ''ادبی سخاوت'' اپنی مثال آپ ہے۔ پیرزادہ ابراہیم حنیف کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''میں ایجوکیشنل کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے علی گڑھ چلا گیا تھا، وہاں سے ابھی آیا ہوں۔ واپسی پر آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ تعجب ہے آپ کو میرا پہلا خط نہیں ملا۔ آپ انجمن ترقی اردو کی شاخ قائم کرنے میں جو سعی فرما رہے ہیں وہ نہایت قابل قدر اور لائق شکریہ ہے۔ خدا کرے آپ کو اس میں پوری کامیابی ہو۔ مجھ سے جہاں تک ممکن ہوگا، آپ کو امداد دینے میں دریغ نہ کروں گا'' (۴۴)

رقعات عبدالحق سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولوی عبدالحق اپنی تجاویز میں ندامت اور معذرت خواہانہ لہجہ بھی استعمال کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ کسر نفسی کا پہلو بھی آب و تاب سے موجود ہے۔ وہ بلاشبہ باریک بین تھے۔ ان کے خطوط سے باریک اور اہم امور پر گفتگو شامل ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وضاحتی اور تفصیلی پیرائے میں اظہار بھی ملتا ہے جس سے قاری کو نقطۂ نظر سمجھنے میں دقت محسوس نہیں ہوتی۔ وہ مخاطب کی بجا طور پر تعریف بھی کرتے نظر آتے ہیں۔ ابن انشاء کے نام لکھے خط کا اسلوب دیکھئے:

> ''عزیز من سلمہ۔ میں نے تمہارا وہ مضمون پڑھا جو اس آوارہ کوئے نااہلاں کی نسبت ڈان میں لکھا ہے۔ تمہاری زبان اور حسن بیان کی کیا تعریف کروں، پڑھ کر مجھے بہت رشک ہوا۔ مگر تم نے بہت جلدی کی۔ کچھ دن اور ٹھہر جاتے تو اچھا ہوتا۔ پھر آزادی جو چاہتے لکھتے۔ شاید تمہیں زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ اب اس کے بعد خدا کے لئے کچھ نہ لکھنا۔ میں اپنے دوستوں اور عزیزوں کو ہمیشہ ایسی تحریروں سے منع کرتا ہوں۔ اس سے لوگوں کو حسد ہوتا اور میرے کام میں خلل پڑتا ہے۔ تعریف اور برائی دونوں، کام میں مخل ہوتی ہیں۔ قدرت نے تمہیں انشاء پردازی کی ایسی اچھی صلاحیت عطا کی ہے جو کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے، اس سے کبھی کوئی ایسا کام نہ لینا جو خودداری اور قومی غیرت کے خلاف ہو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں صحت و عافیت سے رکھے اور دولت علم سے مالا مال کرے'' (۴۵)

ڈاکٹر بدر منیر کی ''رقعات عبدالحق'' سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ مولوی عبدالحق جس مکتوب الیہ

سے بھی مخاطب ہوئے، وفورِ اخلاص اس خط کا خاصا نظر آتا ہے۔ بلاشبہ ان کے خطوط سراپا اخلاص ہیں اور بیشتر کا موضوع ''اردو'' ہے۔ اس کے علاوہ اردو گرامر پر گہری نظر ہے اور ان کی اس گرفت سے قاری محظوظ ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی اصلاح بھی کرتا ہے۔ ان کا مطمحِ نظر علم و ادب ہے۔ جہاں ماضی کی باتیں اور یادداشتیں ہیں، وہاں رسائل و جرائد، ان کی اشاعت پر بحث بھی ملتی ہے اور مصنفین اور تصانیف بارے قاری کو تعارف بھی ملتا ہے۔ ان خطوط سے وہ ایک صائب الرائے کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ وہ احسن مارہروی کے نام رقم طراز ہیں:

> ''آپ نے ''کیسے'' کے متعلق جو تحقیق لکھی ہے، اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں، لیکن مولوی عبدالحلیم صاحب شرر کا نیا ناول ماہ ملک جو میرے پاس آیا، میں نے اس میں متعدد جگہ کیسے سے کیونکر لکھا دیکھا ہے۔ بہر حال جب فصیح الملک نے فرمادیا ہے تو اس کی گنجائش چون و چرا کی نہیں ہے، میں نے اپنی گریمر میں جہاں کیسے پر بحث کی ہے، وہاں نوٹ میں آپ کی رائے کا اظہار کر دیا ہے۔ میری رائے فصیح الملک کی بابت یہ ہے کہ آپ اسے عام مضامین کی جولانگاہ نہ بنائیے، بلکہ اسے خاص زبان کی تحقیق اور بحث کے لئے مخصوص رکھیے، یہی تخصیص اس کی خوبی اور قدر کا باعث ہوگی۔ عام مضامین کے پرچے ملک میں بہترے ہیں، لیکن زبان کی تخصیص و تنقید کے مباحث کے لئے کوئی خاص پرچہ نہیں ہے، یہ کام صرف فصیح الملک ہی کو انجام دینا چاہئے''(۴۶)

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن بدر منیر کی ''رقعاتِ عبدالحق'' بارے ان الفاظ میں اظہارِ خیال کرتے ہیں:

> ''رقعاتِ عبدالحق'' سوا چار سو کے قریب خطوں پر مشتمل ہے۔ بابائے اردو کے پچھلے دس مطبوعہ مجموعوں میں سے کسی ایک میں بھی اتنی زیادہ تعداد میں نئے خط شامل نہیں۔ میں بدر منیر کے اس علمی کارنامے کو انجمن ترقی، اردو کے قیام (۱۹۰۳ء) کی دوسری صدی کے پہلے برس کا سب سے قیمتی نثر خیال کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ ''انجمن'' کے دوسری صدی میں داخل ہونے پر بابائے اردو کے رقعات پر مبنی اس تالیف کا پر جوش استقبال کیا جائے گا''(۴۷)

ڈاکٹر بدر منیر کی نثری خدمات، بطور خاص ''رقعاتِ عبدالحق'' اس لئے بھی اہمیت کی حامل ہے کہ یہ مجموعہ مکمل طور پر اردو ادب کا عکاس ہے جس سے قاری اردو زبان و ادب اور اس کی باریکیوں سے آشنا ہوتا ہے۔ اردو زبان کے الفاظ حروف، عروض اور بحور پر بھی سیر حاصل بحث ہے۔ بطور خاص بحروں سے متعلق اہم تجاویز ہیں جس سے قاری میں اردو زبان و ادب کی جانب دلچسپی بڑھتی ہے۔ مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''مثلث کی جگہ سہ رکن (ترکن)، مربع کی جگہ چورکن، مخمس کی جگہ پن رکن (پنج رکن) بحروں کے نام تجویز کیے جائیں، تاکہ نام سہل ہو جائیں اور اسم خود مسمی پر دلالت کرے۔ میری رائے میں جہاں تک ممکن ہو،

اصطلاحات میں ثقالت، دقت اور غرابت کو رفع کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، جماعتی تقسیم میں بھی یہی عمل ہونا چاہیے، تشدید والے عربی نام کیا ضروری ہیں۔۳۷۰ بحروں کا جو نقشہ ہے، اس میں ایک خانہ اور ہونا چاہئے جس میں یہ بتایا جائے کہ یہ بحر اردو میں مروج و مشہور ہے یا نہیں ہے، اس لیے مروج و مشہور کی جگہ خانے میں م اور غیر مشہور و غیر مروج کے لئے غ کافی ہے۔ آخری نوٹ میں یہ بتا دیا جائے کہ کل مشہور و مروج بحریں اتنی ہیں اور ان کے سامنے خانے میں م لکھ دیا ہے‘‘ (۴۸)

ان خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولوی عبدالحق بطور خاص ذی فہم لوگوں سے رابطہ رکھتے تھے، علم و ادب جن کا اوڑھنا بچھونا تھا، یہی وجہ ہے کہ ہر دوسرے خط میں علمی و ادبی سرگرمیوں کا ذکر موجود ہے، جس سے ان کے میلانات کا پتا چلتا ہے اور کہیں وضاحتی اسلوب سے قاری کو ان سرگرمیوں کے علاوہ ادبی جرائد سے واقفیت کا موقع بھی ملتا ہے۔ اس پر مستزاد مختلف ادبی انجمنوں کے سالانہ جلسوں کا بھی ذکر ہے۔ اس کے ذکر کے پہلو بہ پہلو مکاتیب میں مختلف حقیقی کرداروں سے شناسائی بھی حاصل ہوتی ہے۔ جس سے تشنگان علم و ادب، علمی شخصیات سے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ نیز علمی و ادبی سرگرمیوں کی تاخیر کی وجہ سے وہ کچھ فکرمند بھی دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے نام لکھے خط میں جہاں فن ترجمہ کاری کو سراہتے ہیں، وہاں ادبی تقاریب کی رپورٹ لکھنا بھی ان کا مشغلہ ہے:

’’میں ابھی علی گڑھ سے واپس آیا ہوں۔ کانفرنس بہت کامیاب رہی۔ توقع سے زیادہ مہمان آئے اور تمام کام خیر و خوبی سے ختم ہو گیا۔ پہلے دن کی صدارت راجہ صاحب محمود آباد نے کی اور دوسرے دن نواب مہدی یار جنگ نے۔ دو دن بے حد مصروفیت رہی۔ اب میں پوری رپورٹ مکمل کر کے چھپنے کے لئے اورنگ آباد بھیج دوں گا‘‘ (۴۹)

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کو ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں، جس سے ان کی تحریر میں مزاح کا رنگ غالب ہے:

’’لاماہٹا کٹا موجود ہے، کھانے کے وقت پر ضرور پہنچ جاتا ہے اور میاؤں میاؤں کر کے توجہ دلاتا ہے۔ ناشتے اور رات کے کھانے پر تو اسے کچھ مل جاتا ہے مگر جب دوپہر کو میاؤں میاؤں کر کے آتا ہے تو کچھ نہیں ملتا۔ اس لیے وہ تم سے اور حمیدہ سے کہتا ہے کہ ’’میں آؤں، میں آؤں‘‘ (۵۰)

’’رقعات عبدالحق‘‘ سے اس حقیقت سے بھی پردہ اٹھتا ہے کہ مولوی عبدالحق نے خود کو ادب کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جا بجا ان کی ادبی مصروفیات کا ذکر اور انہی ادبی سرگرمیوں کے سبب انہوں نے دنیا کی مختلف جگہوں کا سفر بھی کیا۔ خطوط میں اشعار کا احوال بھی ملتا ہے۔ ایک موقع پر ان الفاظ میں خامہ فرسائی

کرتے ہیں:

''میں آج کل سفر میں ہوں۔فروری کے آخری ہفتے سے دہلی سے چلا۔بمبئی، گجرات، کرناٹک کا دورہ کر کے یہاں پہنچا ہوں۔اب مہاراشٹر کا دورہ کر رہا ہوں۔شہروں کے علاوہ قصبات اور دیہات میں بھی گیا۔لوگ عام طور پر اردو کے دلدادہ معلوم ہوتے ہیں'' (۵۱)

ان کی جہاں تراجم پر گہری نظر ہے، جس بارے ان کے خطوط میں علمی مشورے بھی شامل ہیں، وہ لغات سے بھی خاصی دلچسپی رکھتے ہیں۔اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ قاری بلاواسطہ طور پر اس اہم لغت سے واقفیت حاصل کر لیتا ہے۔انہوں نے نیک نیتی اور قوت ارادی کے تحت لوگوں کو روزگار بھی مہیا کیا اور ان کے لئے آسانیاں پیدا کیں۔ایسے کئی واقعات اور بطور خاص تاریخی واقعات سے قاری کو شناسائی حاصل ہوتی ہے۔ ایک جگہ تحریر کرتے ہیں:

''بمبئی میں اردو کانفرنس ہے۔۲۳، ۲۴، ۲۵ فروری کو بمبئی والوں کا ایک سال سے تقاضا تھا۔ وہاں جانا ضروری ہے۔۱۳ مارچ کو حیدرآباد میں یوم حالی ہے اور ۲ مارچ کو اردو کانفرنس احمد نگر میں۔ان سب کو ایک ہی دورے میں بھگتا دوں گا'' (۵۲)

بدرمنیر کی نثری خدمات بارے ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی رائے ملاحظہ کیجئے:

''بدرمنیر نے بابائے اردو مولوی عبدالحق کے بکھرے ہوئے خطوط کی تدوین کا کام محنت اور سلیقے سے انجام دیا ہے۔ یہ مولوی عبدالحق کے فکر وفہم اور فراست و ذکاوت کو جاننے میں کلید کا کام دیتے ہیں۔اس علمی کام پر انہیں ۱۹۹۷ء میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد نے ایم فل (اردو) کی سند عطا کی'' (۵۳)

تعزیتی خطوط کے علاوہ تاکیدی اسلوب اور اشارتی زبان بھی موجود ہے۔''بڑی اسامی'' کہہ کر وہ کفایتاً یا اشارتاً کسی کا ذکر بھی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔علاوہ ازیں وہ شخصی اوصاف پر تبصرہ کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔عبداللطیف اعظمی کے نام خط میں شبلی وحالی کا موازنہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''مولانا شبلی کی طبیعت میں ضبط بالکل نہ تھا اور حالی بڑے ضابطہ تھے۔مولانا شبلی کی یہ عادت بھی تھی کہ وہ نجی صحبتوں میں ایسی باتیں کرتے تھے، جن سے سرسید اور مولانا حالی کی تنقیص نکلتی تھی۔اس کے برخلاف مولانا حالی بڑے صاحب دل آدمی تھے۔انہوں نے کبھی مولانا شبلی کے بارے میں کوئی بے جا بات نہیں کہی، بلکہ ہمیشہ ان کی تعریف کی۔ان کتابوں پر بڑے اچھے تبصرے کیے اور جو باتیں قابل تعریف تھیں، ان کی جی کھول کر داد دی۔مولانا شبلی کا فارسی کلام جب شائع ہوا تو مولانا حالی نے اس کو دیکھ کر فرمایا: ''میرا ارادہ تھا کہ میں اپنا فارسی کلام مرتب کروں، لیکن آپ کا کام دیکھ کر میرا کلام میری نظر سے گر گیا ہے اور میں نے یہ ارادہ ترک کر دیا ہے۔مولانا حالی شبلی کی بڑی عزت کرتے تھے'' (۵۴)

اس طرح اسی مکتوب میں ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں:

''اسی طرح میں نے کراچی کے ایک رسالے (ماہنامہ انشاء۔ اکتوبر ۵۹ء) میں اپنے طالب علمی کے زمانے کے بارے میں ایک مضمون لکھا تھا۔ اس میں مولانا شبلی کا تذکرہ ان الفاظ میں تھا۔ کالج میں تمام پروفیسر سوائے عربی، فارسی سنسکرت اور ریاضی کے انگریز تھے۔ فارسی، عربی کے پروفیسر مولانا شبلی اور مولانا عباس حسین تھے، ریاضی کے بابو بکر جی، مولانا شبلی، شاعر، ادیب اور مورخ تھے۔ ان کی جماعت میں بیٹھ کر جی خوش ہو جاتا تھا، وہ موقع موقع سے ادبی نکات اور اساتذہ کے اشعار اور لطائف یا تاریخی واقعات اس طرح بیان کرتے تھے کہ درس کا حق ادا ہو جاتا تھا'' (۵۵)

مولوی عبدالحق کا علمی و ادبی قد کاٹھ اپنی مثال آپ ہے، ہر دور کے تشنگان علم و ادب جس کے معترف رہیں گے۔ وہ اردو ادب کے حوالے سے ایک ایسا روشنیوں کا مینار ہیں جس سے تا ابد لوگ رہنمائی حاصل کرتے رہیں گے۔ ان خطوط سے ان کا احوال بھی دیکھنے کو ملتا ہے اور بطور خاص ان کی تعلیم و تربیت بارے کچھ حقائق سامنے آتے ہیں جو قاری کے لئے نہایت اہم ہیں۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر بدر منیر کی یہ خدمات نا قابل فراموش ہیں۔ رقعات عبدالحق میں انہوں نے شیخ اکرام ربانی کے نام مولوی عبدالحق کا مکتوب شامل کیا ہے جس میں وہ اپنا احوال اور تعلیم و تربیت کا ذکر کرتے ہیں، ملاحظہ کیجئے:

''آپ کا خط پہنچا، جس نے ایک ایسی یاد تازہ کر دی جو میرے لئے موجب مسرت ہے۔ آپ کے والد مرحوم شیخ کرم داد صاحب گوجرانوالہ کے مشن ہائی سکول میں معلم تھے اور میں طالب علم تھا۔ وہ میرے حال پر بڑے مہربان تھے اور بہت شفقت فرماتے تھے۔ کچھ دنوں بعد ہی علی گڑھ چلا آیا اور ایم۔ اے۔ او کالج میں داخل ہو گیا۔ اس کے چند سال بعد جب علی گڑھ کالج میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا تو آپ کے والد بھی اس میں شرکت کے لیے تشریف لائے تھے۔ اس موقع پر ان سے ملاقات ہوئی اور وہ مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد میں حیدرآباد دکن چلا گیا۔ بہت عرصے کے بعد جب میں صوبہ اورنگ کا صدر مہتمم تعلیمات تھا، آپ کے والد کا خط آیا۔ (انہوں نے شاید اخباروں میں میرا نام پڑھا تھا) اور مجھ سے دریافت کیا، کیا تم وہی عبدالحق ہو جو کچھ دن گوجرانوالہ میں تھا۔ جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ میں وہی ہوں تو وہ بہت خوش ہوئے اور کبھی کبھی پڑھنے کے لئے مجھ سے کتابیں طلب کر لیا کرتے تھے'' (۵۶)

ان خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولوی عبدالحق دیگر زبانوں کے حوالے سے فراخ دل تھے۔ انہوں نے اپنے خطوط میں اس حوالے سے خاصی فراخ دلی سے کام لیا ہے اور دیگر زبانوں کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ اسی سلسلے میں وہ دنیا میں ہونے والی مختلف کانفرنسوں میں شرکت بھی کرتے رہے۔ وہ خاص علمی ذہن کے مالک تھے اور اس بات کے خواہاں تھے کہ ہم جدید دور کے تقاضوں کا ادراک کر سکیں۔ آفاق صدیقی کے نام خط میں

اردو اور سائنس پر تبصرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''یہاں ۳ سے ۷ اپریل تک سائنس کانفرنس ہے، میں نے سائنس والوں (کو) انجمن میں مدعو کیا ہے، نیز اردو کی سائنس کتابیں کانفرنس میں پیش کرنا چاہتا ہوں، تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ سائنس کی تعلیم کے لئے اردو میں کتابوں کا کافی ذخیرہ ہے۔ علاوہ اس کے یہ کوشش کر رہا ہوں کہ ان حضرات سے رسالہ سائنس میں مضامین لکھنے کا وعدہ لوں۔ یہ رسالہ اپریل میں جاری ہو جائے گا اور مجلس سائنس میں جو ہم نے حال میں قائم کی ہے، اردو لیکچر دینا چاہتا ہوں''(۵۷)

ڈاکٹر رحیم بخش شاہین مولوی عبدالحق کے مکاتیب بارے رقمطراز ہیں:

''ان کی خوشی اور غم، صحت اور بیماری اسی ایک ادارے (انجمن ترقی اردو) کی کامیابیوں اور ناکامیوں کے تابع ہو کر رہ گئی۔ ان کے خطوں میں بھی اردو زبان اور انجمن کا ذکر تمام امور پر حاوی ہے۔ کہیں کتابوں کے پروف پڑھنے کا ذکر ہے اور کہیں کتابوں کی اشاعت کی اطلاع کہیں مسودوں کے ملنے کی خبر ہے تو کہیں ان پر نظر ثانی کا تذکرہ ہے۔ اس کے علاوہ انجمن کی شاخیں کھولنے، چندہ اور امداد حاصل کرنے اور کانفرنسیں منعقد کرنے کا ذکر بھی کثرت سے ملتا ہے''(۵۸)

مکاتیب سے مولوی عبدالحق کا شاعری کے ساتھ گہرا لگاؤ بخوبی ظاہر ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر بدر منیر کی یہ تحقیقی کاوش کہ انہوں نے اہم مکاتیب کا کھوج لگایا اور قاری کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ مولوی عبدالحق کے منفرد اوصاف سے واقف ہو سکے۔ شاعری کے ساتھ لگاؤ کے ضمن میں وہ غزل اور نظم پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہیں، ملاحظہ کیجئے:

''حقیقت یہ ہے کہ صرف ردیف اور قافیے ہی کے اعتبار سے انہیں غزلیں کہہ سکتے ہیں ورنہ نہایت عمدہ مسلسل نظمیں ہیں۔ آپ نے خوب کیا کہ غزل گوؤں کو ایک اور رستہ بجھا دیا''(۵۹)

بدر منیر کے مدون کردہ مولوی عبدالحق کے خطوط تاریخی اعتبار سے بھی بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ ان مکاتیب میں تاریخی واقعات کا شامل ہونا ان کی اہمیت کو دوچند کر دیتا ہے۔ ایسے یاریخی واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی عبدالحق اردو کالج کے قیام میں بھی متحرک رہے اور وقتاً فوقتاً دلچسپی کا اظہار کرتے رہے۔ اس ضمن میں سید حاذق علی کے نام خط میں یوں اظہار کرتے ہیں:

''آپ نے حیدرآباد میں اردو کالج کے قیام کے متعلق جو خیال ظاہر فرمایا ہے، وہ ہر لحاظ سے قابل قدر اور لائق عمل ہے۔ اس کے متعلق میرا وائس چانسلر کو لکھنا، اس وقت کچھ کارگر نہ ہوگا۔ اس کی موثر صورت یہ ہونی چاہیے کہ آپ وہاں کی دوسری انجمنوں کے اتحاد سے حیدرآباد میں اردو کانفرنس کے انعقاد کا اہتمام کریں۔ میں نے اس بارے میں سعید مبارک علی شاہ کو بھی لکھا ہے۔ ان سے آپ ضرور مشورہ کریں اور اس کانفرنس

میں بالاتفاق ایک قرارداد اردو کالج کے قیام کی منظور کی جائے۔ کانفرنس کے اختتام کے بعد ہم ایک وفد لے کر وائس چانسلر کی خدمت میں حاضر ہوں اور یہ قرارداد پیش کر کے ان سے قیام کالج کے لئے امداد کے طالب ہوں۔ یہ طریقہ بہت زیادہ موثر اور کارگر ہوگا۔ لیکن یہ یاد رہے کہ کانفرنس کا انعقاد سب جماعتوں کے مشورے اور اتفاق سے عمل میں آئے، یہ بہت ضروری ہے۔ چونکہ یہ قومی خدمت ہے اور قوم کا کام ہے۔ اس لیے سب کا اتفاق سے کام کرنا لازم ہے۔ اگر باہم کامل اتفاق نہ ہوگا تو کامیابی مشتبہ رہے گی'' (۶۰)

مولوی عبدالحق کے مکاتیب اردو زبان و ادب کے حوالے سے منفرد مقام رکھتے ہیں۔ بدر منیر نے ان خطوط کو مدون کر کے اردو ادب کی جو خدمت کی ہے، وہ صدیوں یاد رکھی جائے گی۔ ان کے خطوط سے اردو چھلکتی ہے۔ ان کو اردو زبان سے شدید الفت ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے خطوط اردو کے طالب علموں کے لئے نہایت افادیت کے حامل ہیں۔ ڈاکٹر داؤد رہبر کے نام خط میں مولوی عبدالحق اردو سے وابستگی پر ان کی تحسین ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''تمہارا خط پہنچا، اردو کے لئے جو کام تم وہاں کر رہے ہو، قومی خدمت ہے، اس لیے جو ایثار بھی تم کرو گے، وہ داخل ثواب ہوگا۔ تم نے کمال کیا کہ اتنی جلدی سے تم نے ترکی زبان میں اس قدر مہارت حاصل کر لی کہ اردو کا درس بغیر امداد ترجمان دینے لگے۔ اس سے مجھے بہت خوشی ہوئی کہ ترکوں کو اردو زبان سے بہت الفت ہے۔ اب چند ترک ایسے تیار کر دو کہ وہ اردو میں بخوبی لکھنے پڑھنے لگیں اور ہم کسی روز ان کی تحریر قومی زبان میں شائع کریں'' (۶۱)

ایک دوسرے موقع پر انقرہ یونیورسٹی کے اردو طلبہ کے نام ایک پیغام میں لکھتے ہیں:

''میں ترک طالب علموں کو مبارک باد دیتا ہوں کہ انہوں نے اردو زبان سیکھنے کا عزم کیا ہے۔ پاکستانیوں اور ترکوں میں قدیم سے مذہبی اور تہذیبی رشتہ موجود ہے۔ زبان کو انسانی تہذیب میں بڑی اہمیت حاصل ہے، اردو زبان سیکھنے سے یہ رشتہ اور زیادہ مضبوط اور قوی ہو جائے گا۔ کسی زبان کے سیکھنے سے اس زبان والوں سے خود بخود دانس ہونے لگتا ہے۔ ہم زبانی سے ہم خیالی پیدا ہوتی ہے اور ہم خیالی اتحاد کی بنیاد استوار کرتی ہے۔ یہ زبان جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، ترکی سے اجنبی نہیں۔ ترکی زبان کے بہت سے لفظ ہماری زبان میں مروج ہیں۔ ہمارا فن حرب خاص کر اس کا رہین منت ہے۔ قدیم شاہی دربار اور عہدوں کے الفاظ اکثر ترکی تھے اور بہت سے کھانوں کے نام اب بھی ترکی ہیں۔ ہماری زبان میں ''رومی'' کے کئی معنی ہیں اور یہ قدیم رشتے کو یاد دلاتا ہے۔ پاکستانیوں کو ترکوں سے جو محبت ہے، اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ تاریخ اس کی شاہد ہے'' (۶۲)

مولوی عبدالحق (۶۳) نے بھی اپنے خطوط کی تدوین کو احسن اقدام قرار دیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان خطوط کا مرکزی موضوع اردو کی ترویج ہے، تو غلط نہ ہوگا۔ دنیا کے کسی خطے کا ذکر بھی کیا گیا تو اس کا واسطہ اردو سے ضرور

نظر آتا ہے۔ مولوی عبدالحق نے ہر سطح پر اردو زبان کی اہمیت میں اضافہ کیا اور اس ضمن میں نیک خواہشات کا اظہار بھی کیا۔ ڈاکٹر داؤد رہبر کے نام لکھتے ہیں:

''بہت دنوں کے بعد تمہارا خط آیا۔ تمہاری اور بیوی بچوں کی خیریت معلوم کر کے اطمینان ہوا۔ مجھے اس سے خوشی ہوئی کہ تم وہاں خوش ہو اور حسب منشا وہاں اردو کی لائبریری قائم کرنے والے ہو۔ میں بھی تمہیں یہاں سے کتابیں بھیجوں گا۔ تمہیں اردو سے جو محبت ہے اس کی وجہ سے میں تمہیں بہت عزیز رکھتا ہوں۔ میری تمنا ہے کہ اردو انٹرنیشنل زبان بن جائے اور وہ تم ہی جیسے اردو کے شیدائی کی بدولت بن سکتی ہے'' (۶۴)

جیسا کہ اردو زبان اور اس کی گرام کے حوالے سے مولوی عبدالحق کی خدمات اور گرفت کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ یہ بات نہایت اہم ہے کہ وہ علم سیکھنے والوں کی ہر طور پر مدد کرتے تھے اور خطوط کے ذریعے اصلاح بھی کرتے تھے۔ کسی خط میں سید دل فضا نے مولوی عبدالحق سے چند الفاظ کے معنی دریافت کئے تو مولوی صاحب نے سیر حاصل گفتگو کی اور معنی و مطالب بتائے، اس خط کا متن ملاحظہ کیجئے:

''ناؤ سنجوگ کے معنی ہیں وہ ساتھ جو ناؤ میں ہو، یعنی تھوڑی دیر کا ساتھ جیسے ریل کی ملاقات۔ ام جانا کے معنے میں اچک جانا، بھر جانا، شل ہو جانا، میر انیس نے ایک مرثیہ میں اس لفظ کو انہی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ پھوڑے کی شکل میں وہ حالت مراد لے جا سکتی ہے کہ جب ٹیس پیدا ہو جائے۔ روکھن: سودا لینے کے بعد بنیا یا کوئی دوکاندار جو ذرا سی مقدار کسی چیز کو اوپر سے دے دیتا ہے یعنی جنس خریدنے کے بعد اس کے علاوہ۔ بے پینڈی کے بدھنے: ایسے شخص کو کہتے ہیں جو ڈانواں ڈول ہو اور کسی اصول پر قائم نہ ہو۔ پکی چھتیسی: اس لڑکی کو کہتے ہیں جو عمر میں کم مگر عقل اور باتوں میں بہت تیز ہو۔ چالاک، ہوشیار عورت کو بھی کہتے ہیں۔ کھیم کسل: کھیم دراصل کشیم ہے جس کے معنے امن، خوشحالی وغیرہ ہیں۔ برہمنوں میں سلام کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ کھیل کسل یعنی صحت و عافیت، سلامتی۔ طرز: دونوں طرح مستعمل ہے۔ نقاب: یہ بھی دونوں طرح مستعمل ہے'' (۶۵)

خطوط کی تاریخی علمی و ادبی اہمیت بارے غلام رسول مہر کی رائے ملاحظہ کیجئے:

''مکاتیب کا سب سے بڑا فائدہ میرے نزدیک یہ ہے کہ صاحب مکاتیب اپنے جذبات و اسیال، احساسات و تاثرات، رجحانات و مرغوبات اور فکر و نظر کے تمام پہلو بے تکلیف آشکار کر دیتا ہے۔ ہم جس طرح کسی آدمی کی زندگی کا حقیقی نقشہ مکاتیب میں دیکھ سکتے ہیں، کسی دوسری چیز میں نہیں دیکھ سکتے'' (۶۶)

علم و ادب کے علاوہ مولوی عبدالحق کے ان خطوط میں ان مظالم کا ذکر بھی ہے جو برصغیر میں وقتاً فوقتاً

مسلمانوں پر ڈھائے گئے۔ چاہے بہار کا ذکر ہو یا بنگال کا، مسلمانوں پر کئے گئے مظالم کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ مولوی عبدالحق بھی اس صورتحال سے بے حد متاثر ہوئے۔ انہی کے الفاظ میں:

''بہار کے قتل و غارت کے حالات اخباروں نیز ان صاحبوں سے سن کر جو بہار سے آئے ہیں۔ ایسا دمہ اور قلق ہوا جو بیان سے باہر ہے۔ اس ہولناک سانحہ نے مسلمانوں پر بہت گہرا اثر کیا ہے۔ آپ بلا تامل اپنے مسودے بھیج دیجیے۔ ان کی پوری پوری احتیاط کی جائے گی اور اس کا اعلان انجمن کے اخبار ''ہماری زبان'' میں بھی کر دیا جائے گا''(٦٧)

اردو کا دیگر زبانوں سے ربط پر بھی سیر حاصل بحث، ان مکاتیب کا حصہ ہے، کہیں اردو اور ترکی، پاکی اور اردو اور کہیں اردو اور اطالوی کا معنی خیز ذکر کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں انجمن ترقی اردو کی خدمات کے باوجود لوگوں کے رویے پر دکھی ہیں۔ اس کا اظہار مولوی عبدالحق کے الفاظ میں:

''اس زمانے میں جیسا کہ اردو پر اور خاص کر انجمن ترقی اردو پر طرح طرح کی آفتیں نازل ہو رہی ہیں، عبدالرحمٰن صدیقی بہت یاد آتے ہیں، وہ زندہ رہتے تو ہماری بہت سی مشکلات رفع ہو جاتیں۔ اب کوئی ایسا نہیں رہا جو ہمارا ہاتھ بٹائے یا آگے بڑھ کر انجمن کی خدمت کرے۔ اس وقت جن لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار ہے، انہیں اردو سے کوئی لگاؤ نہیں، بلکہ ایک گونہ عداوت ہے۔ اس پر انجمن کے بعض ارکان کی بے وفائی اور غداری سخت تکلیف دہ ہے۔ غرض انجمن کا بیڑا منجھدار میں ڈانواں ڈول ہے۔ بظاہر انجام اچھا نظر نہیں آتا۔ دعا کیجیے!''(٦٨)

اوپر بدر منیر کی تالیفات ''دیدہ خوش آب'' اور ''رقعات عبدالحق'' کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ ڈاکٹر بدر منیر واقعی ایک جید محقق کے طور پر ابھرے ہیں جنہوں نے شاعر و ادیب ہونے کے باوصف ایک جید محقق کے طور پر بھی نام کمایا ہے۔ نیز انہوں نے ''دیدہ خوش آب'' میں نامور شعرا کا کلام بھی پیش کیا اور ان شعراء کے احوال کے ساتھ ساتھ شاعری کے انتخاب کو بھی کتاب کی زینت بنایا۔ اس سے یہ سہولت ہوئی کہ قاری خوشاب کے شعری منظر نامے پر بآسانی نظر دوڑا سکتا ہے۔ انہوں نے مولوی عبدالحق کے نادر خطوط کو مدون کر کے ایک اہم علمی و تحقیقی کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ دوران تدوین ان کا اندازِ تحریر خالصتاً تحقیق پر مبنی رہا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے خطوط کا صحیح معنوں میں کھوج لگایا اور اصل متون کو مدنظر رکھتے ہوئے خطوط مدون کئے۔ انہوں نے زبان اور املا کا بھی بھرپور خیال رکھا۔ بدر منیر کی محنت شاقہ سے قاری کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر بدر منیر کی ''دیدہ خوش آب'' اور ''رقعات عبدالحق'' بنیادی طور پر تاریخی دستاویزات کا درجہ رکھتی ہیں اور اپنی مثال آپ ہیں۔ دنیائے ادب سے تعلق رکھنے والے مذکورہ کتب سے لازماً استفادہ کرتے رہیں گے۔

# حوالے/حواشی

۱۔ بدر منیر، دیدہ خوش آب، لاہور: زاہد بشیر پرنٹرز، ۲۰۰۳ء، ص ۲۹
۲۔ یوسف حسین خان، اردو غزل، لاہور: آئینہ ادب، ۱۹۶۴، ص ۲۴۸
۳۔ بدر منیر، دیدہ خوش آب، ص ۲۹
۴۔ ایضاً، ص ۳۱
۵۔ ایضاً، ص ۳۲
۶۔ ایضاً، ص ۲۵
۷۔ انور سدید، اردو ادب کی تحریکیں، کراچی: انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۲۰۱۵ء، ص ۵۰
۸۔ انور سدید، اردو ادب کی تحریکیں، ص ۸۰
۹۔ ایضاً، ص ۸۳
۱۰۔ بدر منیر، دیدہ خوش آب، ص ۲۵
۱۱۔ ایضاً
۱۲۔ ایضاً، ص ۳۳
۱۳۔ حمید اللہ شاہ ہاشمی، فن شعر و شاعری اور روح بلاغت، سن و بار اشاعت ن۔د، ص ۲۵۸
۱۴۔ بدر منیر، دیدہ خوش آب، ص ۳۴
۱۵۔ ایضاً، ص ۳۵
۱۶۔ ایضاً، ص ۳۶
۱۷۔ ایضاً
۱۸۔ ایضاً، ص ۷۷
۱۹۔ ایضاً، ص ۷۸
۲۰۔ عابد علی عابد: البدیع، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء، ص ۲۳۴
۲۱۔ بدر منیر، دیدہ خوش آب، ص ۷۹
۲۲۔ ایضاً، ص ۴۱
۲۳۔ ایضاً، ص ۴۴
۲۴۔ ایضاً، ص ۴۲
۲۵۔ ایضاً
۲۶۔ ایضاً، ص ۴۳

۲۷۔ ایضاً،ص ۴۵

۲۸۔ نجیبہ عارف کے بارے میں بدر منیر لکھتے ہیں، مجھے سر سید احمد خان کی وہ رائے یاد آرہی ہے جو انہوں نے بطور صدر الصدور وقار الملک کی سروس بک پر درج کی تھی۔ انہوں نے لکھا تھا کہ منشی مشتاق حسن سر سنہ دار عدالت ہذا نہایت لائق، محنتی، نہایت کارگزار اور نہایت فہیم افسر ہیں، اگر یہی رائے من وعن نجیبہ عارف کے متعلق قائم کی جائے تو کچھ مضائقہ یا مبالغہ نہ ہوگا ان کے شاندار تعلیمی ریکارڈ کو مدنظر رکھا جائے تو اس میں مزید اضافہ کی گنجائش نکل آئے گی۔ ۱۹۸۶ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ماسٹر آف پبلک ایڈمنسٹریشن ۱۹۸۷ء میں مذکورہ بالا یونیورسٹی سے ایم اے اردو میں گولڈ میڈل اور علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے ایم فل اقبالیات میں گولڈ میڈل کی مستحق ٹھہریں۔
(بدر منیر، دیدہ خوش آب، لاہور: زاہد بشیر پرنٹرز، ۲۰۰۳ء، ص ۸۹)

۲۹۔ ایضاً،ص ۱۱۴

۳۰۔ ایضاً،ص ۲۳

۳۱۔ ایضاً،ص ۸۹

۳۲۔ ارشد محمود ناشاد، اصنافِ ادب، تفہیم وتعبیر، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۶ء، ص ۷۰

۳۳۔ رفیع الدین ہاشمی، اصناف ادب، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹، ص ۹۶

۳۴۔ ارشد محمود ناشاد، اصناف ادب، تفہیم وتعبیر، ص ۷۰

۳۵۔ رفیع الدین ہاشمی، اصنافِ ادب، ص ۹۷

۳۶۔ ارشد محمود ناشاد، اصنافِ ادب، تفہیم وتعبیر، ص ۶۷

۳۷۔ رفیع الدین ہاشمی، اصنافِ ادب، ص ۹۸

۳۸۔ ارشد محمود ناشاد، اصنافِ ادب، ص ۶۹

۳۹۔ بدر منیر، دیدہ خوش آب، ص ۹۰

۴۰۔ ایضاً،ص ۱۷۷

۴۱۔ ایضاً،ص ۱۷۸

۴۲۔ ایضاً،ص ۱۷۸

۴۳۔ ایضاً،ص ۱۷۹

۴۴۔ بدر منیر، رُقعاتِ عبدالحق، خزینہ علم وادب، ۲۰۰۶، ص ۴۶

۴۵۔ ایضاً،ص ۴۹

۴۶۔ ایضاً،ص ۵۲

۴۷۔ ایضاً،ص ۱۴

۴۸۔ ایضاً،ص ۵۳، ۵۴

۴۹۔ ایضاً، ص ۶۶

۵۰۔ ایضاً، ص ۶۷

۵۱۔ ایضاً، ص ۷۳

۵۲۔ ایضاً، ص ۷۹

۵۳۔ ایضاً، ص ن۔د

۵۴۔ ایضاً، ص ۸۶

۵۵۔ ایضاً، ص ۸۸

۵۶۔ ایضاً، ص ۹۲

۵۷۔ ایضاً، ص ۹۷

۵۸۔ رحیم بخش شاہین، مکاتیب عبدالحق، بشمول قومی زبان، کراچی: دسمبر ۱۹۹۲ء، ص ۱۶

۵۹۔ بدر منیر، رُقعاتِ عبدالحق، ص ۹۹

۶۰۔ ایضاً، ص ۱۰۶

۶۱۔ ایضاً، ص ۱۱۷

۶۲۔ ایضاً، ص ۱۱۸

۶۳۔ ''ایک مدت کے بعد تمہارا خط آیا۔ خواجہ مشفق میرے خط جمع کر رہے ہیں۔ نئے خطوں میں سے ایک یہ بھی ہے۔ کوئی ٹکٹ جمع کرتا ہے، کوئی دیا سلائی کی ڈبیاں اور کوئی تیتریاں جن کی بیکاری کا کوئی اور شغل نہیں ہوتا، وہ لوگوں کے دستخط ہی لیے پھرتے ہیں۔ میں نے یہ خط کیا اشاعت کے لئے لکھے گئے؟ یہ بات تو میرے حاشیہ خیال میں بھی نہ تھی کہ کوئی میرے خط حفاظت سے رکھے گا''

(بدر منیر، رُقعاتِ عبدالحق، خزینہ علم و ادب، ۲۰۰۶، ص ۲۵)

۶۴۔ ایضاً، ص ۱۲۲

۶۵۔ ایضاً، ص ۱۲۷

۶۶۔ جلیل احمد قدوائی، مکاتیبِ عبدالحق، کراچی: مکتبہ اسلوب، ۱۹۶۳ء، ص ۲۳۱

۶۷۔ بدر منیر، رُقعاتِ عبدالحق، ص ۱۴۳

۶۸۔ ایضاً، ص ۱۴۷